تحقیقی مجلہ تحقید، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد

CC BY

eISSN:2789-6331
pISSN:2789-4169

منیبہ زہرا نقوی
پی ایچ ڈی ریسرچ سکالر(اردو)، یونیورسٹی آف سرگودھا
ڈاکٹر عبدالعزیز ملک
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو،جی سی یونیورسٹی ،فیصل آباد

Muniba Zahra Naqvi
PhD research scholar (Urdu) at university of Sargodha
Dr.Abdul Aziz Malik
Department of Urdu, GCU Faisalabad.

خطوط لطیف الزّماں خاں بنام ڈاکٹر عارف ثاقب تحقیقی و تنقیدی جائزہ

The Correspondence between Latif uz Zaman Khan and Dr Arif Saqib in a Critical Perspective

ABSTRACT

The correspondence between Prof Latif uz Zaman Khan and Dr Arif Saqib is saturated with such literary genius that the expression can be quoted as a specimen for the art of letter writing. In these letters a mellow frankness along with the diversity of human experiences is scattered everywhere. A civilized yet frank style of giving vent to deepest thoughts mesmerized the readers. These letters encompasses diverse hues of literary trends along with cultural evolution in an illustrious manner.

Keywords: Diversity, Frankness, Evolution, Civilized

اُردو ادب میں خطوط اور خطوط نویسی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شخصی جذبات کو منکشف کرتے ہوئے جس سادگی اور بے تکلفی کا انداز انشائے لطیف میں مضمر ہے وہ کسی اور صنف میں مضمر نظر نہیں آتا۔ خطوط لکھنے کے لیے ضروری نہیں کہ کوئی خیال ذہن میں ہو تو لکھا جائے بلکہ خطوط تو دراصل گفتگو اور بات چیت کی مانند ایک طرح سے اظہارِ خیال کا ذریعہ ہیں۔ جس طرح زندگی اپنی راہیں خود بنا لیتی ہے خط اپنی باتیں خود پیدا کر لیتا ہے۔(۱) خطوط اور خطوط نویسی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انسانی جذبات کا جیسا عمدہ اور بے تکلف اظہار خطوط کے ذریعے کیا جا سکتا ہے وہ کسی اور تحریر کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ یہ اپنے پیرائیہ اظہار سے مکتوب نگار اور مکتوبہ الیہ دونوں کی شخصیت کو یوں کھول کر رکھ دیتے ہیں کہ حجاباتِ من و تو باقی نہیں رہتے۔ خطوط نگاری کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر اچھے خط کو وہ مقصد ضرور پورا کرنا چاہیے کہ جس کے لیے وہ لکھا جا رہا ہے یعنی مکتوب نگار جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ ایسے انداز میں کہے کہ مکتوب الیہ کو پیغام کا قطعی علم ہو جائے۔

خط سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی کا مرّقع ہونے کے ساتھ ساتھ شگفتگی کا احساس رکھتا ہو تو اس کی ادبی وقعت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مدعا نگاری، نجی حیثیت اور اختصار اس کے لیے ضروری ہے۔ مکتوب نویسی کسی خاص اصول یا متعین ضابطے کی پابند نہیں بلکہ مکتوب نگار، مکتوب الیہ سے تعلق کی بنا پر اپنا مافی الضمیر بیان کرتا ہے اور اپنی ذہنی و نفسیاتی کیفیت کھول کر بیان کر دیتا ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح ایک مصنف اپنے خاص نفسی نظام کے ساتھ، جذباتی و اعصابی ساخت کے ساتھ کسی داخلی تحریک یا خارجی واقعہ سے اثر قبول کرتا ہے اور اُس اثر کی وجہ سے اُس کے دل میں اظہار کی جستجو پیدا ہوتی ہے(۲) اسی طرح ایک مکتوب نگار بھی طریقِ اظہار کی جستجو میں اپنا مافی الضمیر خط کے ذریعے بیان کرنے لگتا ہے۔ زمانے کے اثرات اور اُس کا ذوق اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ مدعا نگاری کے پردے میں، تہذیب، ادبی میلانات، دینی تفکرات، اخلاقی رویے، مجلسی و شخصی زندگی کی بو قلمونیاں سبھی کچھ ان خطوط کے پیرایے میں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔

اپنی نوعیت کے اعتبار سے خطوط میں رنگِ اسلوب بھی بدل جاتا ہے۔ جب مکتوب نگارکسی دل گرفتگی، اعزّا کی دنایت، اپنوں کی بے توجہی، کسی یارِ مہرباں کی دائمی یا عارضی جدائی کا شکار ہو تو اس کے اسلوبِ تحریر سے اُس کی مخصوص نفسیاتی کیفیت، قلبی شکستگی اور دکھ عیاں ہو گا، جب کہ خوشی، کامیابی، کامیاب زندگی کی رونقوں سے مالا مال شخص کا اسلوب یکسر جدا ہو گا۔ رفیع الدین ہاشمی ''اصنافِ ادب'' میں خطوط نویسی پر بات کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''ادبی اور قلمی خطوط ایک صنفِ نثر کی حیثیت سے کئی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ کسی مکتوب نگار کے خطوط اس کے میلانات و رجحانات، پسند و ناپسند، عادات، اخلاق، جذباتی و نفسیاتی کیفیتوں، ذہنی و قلبی احساسات اور اس کی شخصیت کی مختلف سطحوں کو قارئین کے سامنے لاتے ہیں۔ خطوط میں مکتوب نگار کی سیرت و شخصیت کے وہ گوشے بھی بے نقاب ہوتے ہیں جو بالعموم عام نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں''۔(۳)

خطوط صرف دو شخصیات کے مابین مکالمہ نہیں بلکہ بعض اوقات یہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے مابین ایک ایسی فکر انگیز گفتگو میں ڈھل جاتا ہے جو بڑی خاموشی سے خود بخود اُس عہد کے رجحانات، ادبی روّیے، شخصِ مذکور کی دلچسپیاں، اُس کی زندگی کے نشیب و فراز، اُس کی مجلسی و ذاتی زندگی کے تنّوع، الغرض ایک سوانح کی صورت بہت کچھ مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ جیسا کہ خطوطِ رشید احمد صدیقی میں ہمیں جن شخصیات کے بارے میں اُن کے لکھے خطوط ملتے ہیں وہ صرف رشید احمد صدیقی کے علمی قد و قامت کی غمازی ہی نہیں کرتے بلکہ ان شخصیات کی زندگیوں کی بھی پرتیں کھولتے چلے جاتے ہیں۔ یہی حال ہم لطیف الزّماں خاں کے خطوط میں دیکھتے ہیں۔ وہ ایک عہد ساز شخصیت کے ساتھ ساتھ فکر و ادب کی ایک بڑی کھیپ کو اپنے ساتھ ساتھ لیے چلتے نظر آتے ہیں۔ یوں یہ شخصیات کبھی ہم پر اپنی زندگیوں کے عکس مرّتب کرتی چلی جاتی ہیں تو کبھی لطیف الزّماں خاں کے ادبی قد و قامت کی راہ سُجھاتی دکھائی دیتی ہیں۔ جس میں ایک منجھے ہوئے استاد کا لیکچر بھی ہے جس میں کبھی ایک دوست کے شکوہ و شکایات، محبت و عنایات کی جھلک بھی ہے اور مان بھی۔ کبھی وہ ایک نقاد کی صورت عصری ادبی رویوں اور تقاضوں پر تبصرہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اس تبصرے میں ان کے گہرے فکری شعور اور مغرب و مشرق کے ادب پر ان کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تبصرہ برائے تبصرہ نہیں ہے بلکہ جانچ پرکھ کا بہترین انداز ہے۔ جس سے ایک حتمی رائے قائم ہوتی نظر آتی ہے۔ کہیں وہ قائل کرتے نظر

آتے ہیں تو کہیں نام نہاد ادیبوں، شاعروں کے لتّے لیتے نظر آتے ہیں۔ لطیف الزّماں خاں کے خطوط کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیں تو ان خطوط میں اسلوبیاتی رچاؤ بھی ہے اور موضوعاتی تنّوع بھی۔

لطیف الزّماں خاں کے مختلف ادبا، شعرا اور پاک و ہند کے دوستوں اور مشاہیر کو لکھے گئے خطوط پانچ ضخیم جلدوں میں ''انشائے لطیف'' کے نام سے ڈاکٹر عارف محمود ثاقب نے مرتّب کیے ہیں۔ ڈاکٹر عارف ثاقب ادبی حلقوں میں ایک اُستاد، محقق اور شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور، مرے کالج سیالکوٹ اور سائنس کالج لاہور سے، بالترتیب لیکچرار، ایسوسی ایٹ پروفیسر اور پروفیسر اردو کی حیثیت سے درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ "مآلِ جنوں" کے نام سے شعری مجموعے کے خالق ہیں۔ جبکہ تحقیقی و تنقیدی کتب میں "انجمن پنجاب کے مشاعرے"، "تنقید"، "بیسویں صدی کا ادبی طرزِ احساس"، "سجاد باقر رضوی کی ادبی خدمات"، "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ اصل حقائق۔صحیح صورتحال (ایک تقابلی جائزہ) "کے ساتھ اختصاص رکھتے ہیں۔

جب ہم لطیف الزّماں خاں کے خطوط کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات بخوبی عیاں ہوتی ہے کہ لطیف الزّماں خاں کے اسلوب میں شگفتگی، سلاست، آمد اور روزمرّہ و محاورہ کا امتزاج اہلِ زبان کے رکھ رکھاؤ کی یاد دلاتا ہے جبکہ موضوعاتی اعتبار سے وہ مشرق و مغرب کے ادب شناسوں کے راستے کے شناور ہیں۔ وہ غالب ، رشید احمد صدیقی اور اُردو ادب کی تمام اصناف پر بے لاگ تبصرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے خطوط میں تحقیقی و تنقیدی شعور کی واضح جھلک ہے۔ نسخۂ امروہہ، نسخۂ خواجہ اور رشید احمد صدیقی کے حوالے سے کی گئی ادبی بددیانتیوں پر ان کی گہری نگاہ رہی۔ اس حوالے سے اُن کے خطوط مکمل مباحث کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ وہ تحقیق کو منطقی انجام تک پہنچانے کے قائل ہیں وہ ہر قیمت پر سچ بولتے نظر آتے ہیں۔ وہ حق کے متلاشی دکھائی دیتے ہیں اور حق پرستوں کا ساتھ بھی دیتے ہیں لیکن ادبی خائنوں اور جھوٹے محققین کی بیچ چوراہے ہنڈیا پھوڑنے میں انھیں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ وہ ایسے کم ظرفوں کے چہرے سے نقاب کھینچتے نظر آتے ہیں۔وہ ہر اُس راہ پر چل کر آواز بلند کرتے ہیں جو حق اور ادبی صداقت کی راہ ہے خواہ اُس کے بدلے آبلے ہی کیوں نہ پھوٹ بہیں یا انگلیاں ہی فگار کیوں نہ ہوں۔

لطیف الزّماں خاں اور ڈاکٹر عارف ثاقب کی رفاقت طویل عرصے پر محیط ہے۔ ۱۹۹۵ء میں جب ڈاکٹر عارف ثاقب پہلی مرتبہ، پی ایچ۔ڈی کے تھیسس کے سلسلے میں لطیف الزّماں خاں سے ملے تو تین چار گھنٹے کی اس ملاقات کے بعد خاں صاحب اُن کے اور وہ خاں صاحب کے ہو گئے۔(۴) ڈاکٹر عارف ثاقب اس تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''خان صاحب ان سارے برسوں میں میرے ساتھ رہے۔ میرے دکھ بانٹے، میری خوشی میں شریک ہوئے۔ میں اُن کے گھر کا حصہ بن گیا۔ وہ میرے بن کے رہے اور آج مجھے یہ سطور لکھتے ہوئے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ خان صاحب سے میرا تعلق انتہائی عقیدت اور محبت کا ہے''۔(۵)

ڈاکٹر عارف ثاقب کو لکھے گئے اُن کے خطوط میں دل لگی ہے، دل دہی ہے، مزاح ہے، اسلوبِ بیاں کی روانی ہے۔ دلی جذبات کی عکاسی ہے۔ تسلی ہے، تشفّی ہے۔ شعر و ادب کی باتیں ہیں، زندگی ہے اور زندگی کے قصے ہیں۔ زندگی کا ہر رنگ ان خطوط میں جا بجا بکھرا ہوا ہے۔ لطیف الزّماں خاں نے ایک خط میں اُردو ادب میں قدیم ایرانی اور زرتشتی اثرات پر بات کی ہے۔ یہ خط تاریخی اور ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ اس خط کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ لطیف الزّماں خاں کا ادبی ذوق غیر معمولی ہے:

''ایران کی تہذیب اور تاریخ کو جانے بغیر ان اثرات کا جاننا ممکن نہیں جنھوں نے ہمارے ادب کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے۔ بعض نام بطور استعارے کے کبھی بطور تلمیح کے ہماری شاعری میں آئے ہیں۔ مثلاً شیریں، فرہاد، افراسیاب، کیخسرو وغیرہ۔ اُردو شاعری بالخصوص اور اُردو ادب بالعموم جس طرح فارسی زبان سے متاثر ہے شاید ہی کسی اور زبان کے اثرات ایسے اور اس طرح ہوں۔''(٦)

لطیف الزّماں خاں ، میرؔ، سوداؔ، دردؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی شاعری میں فارسی کے اثرات کی بات کرتے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں کہ اُردو کے ہر بڑے شاعر نے خواہ وہ کسی بھی عہد یا زمانے سے تعلق رکھتا ہو کبھی نہ کبھی فارسی میں طبع آزمائی بھی کی ہے۔ لطیف الزّماں خاں کا یہ تنقیدی رنگ ایک مرتبہ پھر اُردو ادب کے ناقدین کی یاد دلانے لگتا ہے۔ ماضی کے اثرات اور زبان کا تذکرہ جس رنگ میں لطیف الزّماں خاں نے کیا، وہی انداز سیّد عابد علی عابد کے رنگِ تنقید میں مضمر ہے۔ وہ اُردو غزل میں مروجہ علامتوں، تشبیہات اور استعارے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علامتی اہمیت کا کھوج لگانے کے لیے اور ان کا صحیح مفہوم متعین کرنے کے لیے ہمیں اپنے ماضی کے ورثہ کو کھنگالنا پڑے گا۔ اس کے بغیر ہمارا مطالعہ ناقص، بلکہ گمراہ کن رہے گا''۔(٧)

جبکہ لطیف الزّماں خاں ایرانی اثرات پھیلنے کی توجیہہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''شاہ نامہ اور رزمیہ داستانوں کے تراجم جب اُردو میں کیے گئے تو ایرانی اثرات بڑی تیزی سے پھیلے۔ پھر وہ دور آیا جب طویل داستانیں اُردو میں منتقل کی گئیں۔ داستانِ طلسم ہوشربا اور قصہ امیر حمزہ ہمارے ہاں آج بھی شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ اساطیری دور پر نظر ڈالیے تو کئی ایسے نام ملیں گے جو اُردو ادب میں عام ہیں۔ ایرج، تورج، افراسیاب، تہماسپ، لہراسپ، جمشید وغیرہ اور تاریخی بادشاہوں کے نام اور دیگر افراد مثلاً نوشیرواں، شاہ پور وغیرہ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ طلسم ہوشربا اور امیر حمزہ کی داستان اُردو ادب کا حصہ نہیں ہیں اور جس شخص نے داستانوں کا مطالعہ نہیں کیا وہ اُردو جاننے کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے--- بعض عشقیہ قصے جوں کے توں اور بعض تھوڑی سی ترمیم اور تبدیلی کے بعد اُردو کا حصہ بنے۔ بہرام کور فارسی کی بڑی مشہور مثنوی ہے۔ اُردو کے قدیم شعرا کے ہاں نام میں جزوی تبدیلی کے ساتھ یہ مثنوی موجود ہے۔ ''بہرام اور حسن بانو'' ہشت، بہشت بھی اُردو میں منتقل ہوئی۔ نظامی گنجوی نے گل اندام کے نام سے جو ترجمہ کیا ہے ، وہ مثنوی ''ہفت پیکر'' کا ہے''۔(٨)

لطیف الزّماں خاں کے خطوط میں جہاں غالب اور دیگر شعراء یا شاعری پر سیر حاصل تبصرے ملتے ہیں وہیں ان کے خطوط میں اسلم انصاری کی ایک بے مثال نظم ''گوتم کا آخری وعظ'' پر تبصرہ ملتا ہے۔ اس نظم پر، ڈاکٹر عارف ثاقب کے خطوط میں بھی تبصرہ ملتا ہے جبکہ ایک مکمل تجزیاتی و تنقیدی تبصرہ، ڈاکٹر عارف ثاقب کو لکھے گئے خطوط کے ساتھ لف ہے، جسے جلد پنجم میں شامل کیا گیا ہے۔ اگر لطیف الزّماں خاں کے شعری ذوق کے حوالے سے، اُن کی اس تحقیقی و تنقیدی آراء کا ذکر نہ کیا جائے تو یقینا ایک اہم فکری و علمی تجزیے کو ہم نظر انداز کر دیں گے۔ لطیف الزّماں خاں ، اسلوب انصاری کی اس نظم کو ہمارے عہد کی ایک ایسی بے مثال نظم سے تعبیر کرتے ہیں کہ جو ہر دور کی نظم کہی جا سکتی ہے مگر افسوس کہ شاید ناقدین کی توجہ اس جانب نہیں رہی۔ اس حوالے سے مزید بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وقت گذرنے کے ساتھ انسان کو یہ معلوم ہو گا کہ گوتم کی زندگی کا تجربہ دراصل ہر انسان کا تجربہ ہے۔ اس ڈرامائی نظم میں چار کردار ہیں۔ ایک گوتم، دوسرا وہ جس کی صدا دل میں گونجتی تھی، تیسرا وہ جو اس صدا کو لے اڑا اور چوتھا کردار crowd، وہ ہجوم جس سے گوتم مخاطب ہوئے''۔(۹)

لطیف الزّماں خاں کی ناقدانہ رائے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اس نظم کے اقتباسات کو ایک نظر پڑھیں اور یوں اسے سامنے رکھتے ہوئے لطیف الزّماں خاں کے تبصرے کے ساتھ چلنے اور اس سے لطف اٹھانے میں زیادہ سہولت ہو گی اور وہ تنقیدی آرا ہم بخوبی سمجھ سکیں گے، جس سے لطیف الزّماں خاں ہمیں آگاہ کرنا چاہتے ہیں:

''جو دل میں گونجتی تھی صدا، کون لے گیا؟ — میری متاعِ کربِ وفا، کون لے گیا؟

دیوارِ جاں پہ نقش تھی اک یاد کیا ہوئی؟ — اک آئینہ تھا عکس نما، کون لے گیا؟

وہ آگہی کی شاخِ سخن ریز، کب کٹی؟ — رنگِ بیان و برگِ نوا، کون لے گیا؟

زنجیر سی چھنکتی تھی شاخوں کے آس پاس، — آہنگِ رقصِ موجِ صبا، کون لے گیا؟

جیسے کبھی تلاش کرے گا مجھے کوئی — یہ آج مجھ سے میرا پتا کون لے گیا؟

یہ کون رکھ گیا ہے یہاں بے حسی کی دھول؟ — یہ طاق دل سے غم کا دیا، کون لے گیا؟

میرے تکلّمات کی چھب کس نے چھین لی؟ — وہ میری شاندار انا، کون لے گیا؟

دل تھا کہ باغِ دہر میں اک برگِ زرد رُو — اُس برگِ زرد رُو کو اڑا، کون لے گیا؟''(۱۰)

لطیف الزّماں خاں نظم کے مندرجات کو سامنے رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ گوتم بدھ دل میں گونجنے والی صدا کا کھوج لگانے نکلے کیونکہ جب تک اس آواز کی گونج اُن کے دل میں رہی وہ سرشاری کی کیفیت سے دوچار رہے لیکن جب دل اِس گونج سے خالی ہو گیا تو گوتم کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اس غیر مرئی چیز کو کون اڑا لے گیا؟(۱۱) اسی تجزیے کو آگے بڑھاتے ہوئے لطیف الزّماں خاں رقم طراز ہیں:

''وہ آواز گوتم کے نزدیک ایسی ''متاع'' تھی کہ اسے ''کربِ وفا'' کہا گیا ہے۔ اوّل تو وفا کرنا ہی آسان نہیں ہوتا اور وفا کرنا اور وہ اس حد تک کہ وہ ''کرب'' میں تبدیل ہو جائے اور ''متاع'' معلوم ہونے لگے۔ وہ کون تھا جس کی یاد آتی تو جاتی نہ تھی۔ جانا تو دور کی بات ہے وہ تو ''دیوارِ جاں پہ نقش'' بن گئی تھی۔ کیا اس یاد کا تعلق اُس صدا سے ہے جو ''دل میں گونجتی تھی''، یقینا تعلق ہے۔ وہ یاد ایک ایسا آئنہ تھا جس میں ''من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی'' کی تصویر نظر آتی تھی--- باغیچے میں شاخوں کے آس پاس زنجیر چھنکتی تھی۔ کیا کوئی دیوانہ سلاسل پہننے رقص کرتا تھا۔ کیا یہ بیڑی کی آواز تھی؟ کیا یہ گلے کی زنجیر تھی؟ کوئی ایسا زیور تھا جو زنجیر کی مانند آواز دیتا تھا۔ لیکن گوتم اس کا تعین نہیں کر

پائے۔ اسی لیے ''زنجیر سی'' کہتے ہیں۔ ''موجِ صبا'' کا آہنگِ رقص اُس زنجیر کو چھنک چھنک کر ملتا تھا اور حادثہ یہ پیش آیا کہ کوئی آیا اور موجِ صبا ''زنجیر'' کے ''آہنگِ رقص'' کو لے گیا اور زنجیر کے چھنکنے، موجِ صبا کے اُس آہنگِ رقص کو اُس ''صدا'' سے ایک نامعلوم رشتہ تھا جو کوئی آیا اور چرا لے گیا''۔(۱۲)

لطیف الزّماں خاں کا یہ تجزیہ ہمیں باور کرواتا ہے کہ گوتم دراصل اس ''آگہی'' کو سمجھنا چاہتے تھے جو کائنات کی تخلیق اور وجود کے سفر کی انتہا میں مضمر ہے۔ لطیف الزّماں کا یہ تجزیہ اُس بے خودی کی کیفیت کا پتا دیتا ہے جس میں گم ہو کر ''گوتم'' تلاشِ حقیقت کی خاطر گھر سے نکلے اور حاصلِ زیست کا پتا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لطیف الزّماں خاں کہتے ہیں کہ یہ وہ صداقت کا رستہ تھا کہ جس پر چلتے ہوئے وہ حیرت، استعجاب، شک، خوف، غرض ہر حالت سے آزاد ہو گئے۔(۱۳) اسی پر مزید فلسفیانہ گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جس گیان اور دھیان کو وہ اختیار کر رہے تھے ، وہاں ایمان، شردھا(اعتقاد) مقصد اور اس کو حاصل کرنے کی قوت ہر قدم پر حاصل ہونے والی تھی۔ گوتم کو طرح طرح کے سوالات نے گھیرے رکھا کہ خیال آیا:

دل تھا کہ باغِ دہر میں اک برگِ زرد رُو اُس برگِ زرد رُو کو اڑا کون لے گیا؟

میرؔ نے دل کو پُرخوں بتایا ہے لیکن گوتم کا دل زر دپتے کی طرح تھا یا ہو گیا تھا۔ اب اسی کے ایک معنی کہ خاتمہ قریب ہے اور جب انھیں یہ یقین ہو گیا کہ ''انت '' آ گیا ہے، تو معلوم ہوا کہ ''تمام دکھ ہے'' --- زندگی کا راز یہی قرار پایا کہ سیاہ ہو یا سفید، ہستی ہو یا نیستی، دکھاوا، ظہور، بالیدگی سب دکھ ہے۔ زندگی کے آثار، نشانات، علامت، قبر کا نشاں، وجود، کائنات، شان و شوکت، دید، نظارہ، شہرت ، ناموری، غرض سب کچھ صرف ایک لفظ دکھ میں سمٹ گیا ہے۔ زندگی تو ہے ہی دکھ، موت بھی دکھ ہے اور یہ کائنات جو مٹ جائے گی یہ بھی دُکھ ہے''۔(۱۴)

لطیف الزّماں خاں پرمغز اور مدلل پیرایے میں اس تجزیے کو سمیٹتے ہوئے بے مثل کلمات لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلم انصاری نے اس نظم کا پیش منظر بعد میں قلم بند کیا گیا اور نظم پہلے لکھی۔ اگر وہ پیش منظر پہلے لکھتے تو شاید یہ نظم اُس تاثیر سے محروم ہو جاتی جو کسی حساس انسان کے رگ و پے میں اتر جانی والی کیفیت پر مبنی ہے۔(۱۵)یہ بات بجا طور پر محسوس کی جا سکتی ہے کہ لطیف الزّماں خاں ، ڈاکٹر عارف ثاقب کو لکھے ان خطوط میں بسا اوقات ایسی لطافت اور شگفتگی کی کرنیں بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ گویا وہ اپنی پرانی یادوں کو دہرا رہے ہوں، یا جوانی کے فطری میلان کو یاد کر رہے ہوں:

''آپ نے موتیے کے پھولوں کا ذکر کیا ہے۔ موتیا ایسا پھول ہے جو عام تو بہت ہے، لیکن اس کی خوش بو سے جوانی کی یادیں وابستہ ہوتی ہیں''۔(۱۶)

وہ دل لگی اور شرارت کے پیرایے میں نفسیاتی تجزیہ بھی کرنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر عارف کی اس بات پر کہ ''زینے کی سیڑھیاں ویران ہیں'' خاں صاحب کہتے ہیں کہ ان سیڑھیوں نے کیسے کیسے احباب اور حسیناؤں کے قدموں کی چاپ سنی ہو گی۔ آپ خود کو بھی ویران کہتے ہیں مگر میرا خیال یہ ہے کہ انسان جتنا گوشہ نشین ہو گا۔ اُس میں ارتباط اور محبت اُن لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جو انبوہ اور ہجوم کو پسند کرتے ہیں''۔(۱۷)لطیف الزّماں خاں ، ڈاکٹر عارف ثاقب سے محض دل لگی اور

شرارت ہی نہیں کرتے بلکہ اس دل لگی کے رنگ میں جب خود بھی رچ بس جاتے ہیں تو اُن کے قلم سے معنویت، عشق اور معرفت کا ایک جہاں صفحۂ قرطاس پر بکھر جاتا ہے:

> ''شہرِ عشق طلسماتی ہوتا ہے اور ایسے شہر میں حصولِ علم (وہ نہیں جو مکتب و مدرسہ یا یونی ورسٹی میں حاصل ہوتاہے) بڑی جان جوکھوں کا کام ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی سیڑھیاں، دالان، سبزہ زار، درختوں کے سائے میں بیٹھ کر معلوم نہیں کتنوں نے علم حاصل کیا۔ عقل اور عشق دونوں اس طلسماتی شہر کی دین ہوتے ہیں اور یہ قریہ قریہ بستی بستی پائے جاتے ہیں--- مجھے اہلِ دل اور اہلِ نظر ہونے کا دعوی بھی نہیں مگر شاعری کے مطالعہ سے اتنی بات ضرور سمجھائی ہے کہ علم ہی سے اور یہ علم اسکول،کالج اور یونی ورسٹی کی نصابی کتب میں نہیں ملتا اس کے لیے شرطِ اوّل تو دل کا خون کرنا ہوتا ہے۔ درد اور ٹیسیں جھیلنے کا سلیقہ آنا چاہیے۔ تب علم سے انسان خدا کو پہچانتا اور آدمی سے انسان بنتا ہے۔ شخصیت اور کردار کی تعمیر اُس وقت ہوتی ہے جب دل میں ٹیسیں اٹھتی ہیں اور یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب علم، عشق و سعادت حاصل ہوتی ہے۔ اس تحصیلِ علم کے بعد اگلی منزل گداز قلب کی ہے کہ اُ س کے بغیر انسان عرفان کی منزل سے نہیں گزر سکتا۔ گدازِ قلب ہی سے انسان دوسروں کے دکھ، درد کو سمجھنے کے قابل ہوتا ہے۔''(۱۸)

مندرجہ بالا خط میں عشق اور علم کی تعبیر و تفسیر کے سفر کی روداد اور دونوں کے باہم امتزاج سے معرفت کی جس راہ کا پتا لطیف الزّماں خاں سمجھا رہے ہیں ، وہ انداز ایک مبلغ کا انداز ہے۔ ایک مصلح کا، ایک انشا پرداز کا، ایک استاد کا، ایک ہمدرد کا، ایک دوست کا اور سب سے بڑھ کر ایک ایسے انسان کا انداز ہے جو خود ان وادیوں سے گزرا ہے، جو محبت کی لطافت اور حلاوت سے بخوبی آشنا ہے جسے اِس راہِ پُرخار پر چلنا آتا ہے اور جس کا جی راہ کو پُرخار دیکھ کر خوش ہوتا ہے، جو مردانگی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنا جانتا بھی ہے اور دوسرے کی مردانگی کو بھی مہمیزکرتے ہوئے اُسے بھی پامردی اور استقلال کا درس دیتے ہوئے نظر آتا ہے۔ جس کے سینے میں دل تو ہے، مگر وہ دل کو پامال کرنا اور نفس کو آلودہ کرنا پسند نہیں کرتا۔ جو علم و عشق کے امتزاج سے عرفانِ زیست کی منازل طے کرتے ہوئے زندگی بتانا چاہتا ہے۔ ایک استاد کی حیثیت سے لیکچر کیسا اور کیا ہونا چاہیے۔ یہ تفہیم بیان کرتے ہوئے وہ اُن تمام اساتذہ کو سیکھ دے رہے ہیں جو اس راہ پر کھڑے ہیں یا جنھیں اس راہ پر چلنا ہے۔

لطیف الزّماں خاں کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ کسی استاد کا بطریقِ احسن، طلبہ کو نصاب کی تعلیم دینا اِس کے حاسدین کے گروہ میں اضافہ کر دیتا ہے۔ ساتھی اساتذہ، کولیگ وغیرہ ایسے استاد کو مشکل سے برداشت کرتے ہیں، جو طلبہ کے لیے ہر دل عزیز اور پسندیدہ ہو۔ اِس حوالے سے ڈاکٹر عارف ثاقب کی طرف سے لکھے گئے خط کے جواب میں وہ انھیں حوصلہ بھی دیتے ہیں اور راہ بھی دکھاتے نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ مجھے اِس بات کا اندازہ ہے کہ جیسے جیسے طلبہ کے مابین آپ کی شخصیّت پرکشش ہوتی جائے گی۔ آپ کے حاسدوں اور بدخواہوں میں اضافہ ہوتا جائے گا لیکن میں آپ کو یہی نصیحت کروں گا کہ آپ افسردہ نہ ہوں اور غم نہ کریں۔ بحیثیت استاد اپنی رَوش کو ترک نہ کیجیے۔ بس اس بات کا خیال رکھیں کہ لیکچر دیتے وقت آپ جو زبان استعمال کریں اُس میں وہ بہاؤ ہونا چاہیے جو دریا میں ہوتا ہے۔ کبھی تیز اور کبھی سبک خرام

اور آپ کے اندازِ تخاطب اور تقریر میں وہ لطف اور لذّت، کاٹ اور تیزی ہونی چاہیے جو تلوار کے وار سے حاسدوں کا دل چیر دے اور جب وہ ہوش میں آئیں تو فاسد خون ختم ہو گیا ہو''۔(۱۹)

ڈاکٹر عارف ثاقب کو لکھے گئے ان کے خطوط میں نظم پارے، غزلیں اور اشعار جا بجا ملتے ہیں۔ یہ خطوط مختلف شعرا کی شاعری پر مبنی ہیں لیکن زیادہ تر نظم پارے، نظمیں، غزلیں (ڈاکٹر وحید اختر جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فلسفہ کے پروفیسر تھے) کی شاعری پر مبنی ہیں۔ لطیف الزّماں خاں کا حافظہ کمال کا ہے ،وہ طویل نظمیں بڑی روانی سے لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اِن نظموں اور اشعار کے انتخاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود لطیف الزّماں خاں کا شعری ذوق بھی اعلیٰ پائے کا ہے۔ ڈاکٹر وحید اختر کی نظم ''مداوا'' انھی خطوط میں شامل ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر لطیف الزّماں خاں کے شعری ذوق کی داد دینے کو جی چاہتا ہے:

''یہ جہاں گیر اندھیرا یہ امڈتی برسات
دل کی بجھتی ہوئی شمعوں کو نگلتی ہوئی رات
زد میں بے رحم ہواؤں کا دیا کیسے جلے؟
اس اندھیرے کا مداوا تو کوئی کس طرح کرے!
سینۂ ہستیٔ تنہا سے دھواں اٹھتا ہے،
ہر نفس اب تو بہ اندازِ فغاں اُٹھتا ہے
کتنی دوشیزہ تمناؤں کی جلتی ہے چتا
کتنی مٹتی ہوئی قبروں کے نشاں ملتے ہیں''(۲۰)

ایسی ہی بے شمار نظمیں اور طویل نظم پارے ڈاکٹر عارف ثاقب کو لکھے گئے خطوط میں معنویت اور محوّیت کے اک جہاں میں لے جاتی ہیں۔ لطیف الزّماں خاں جس شاعری کے نمونے اپنے دوست احباب کو ان مکتوبات میں لکھتے یا ان پر تبصرہ کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں۔ وہ نظم پارے اور شاعری کلاسیکی رنگ لیے ہوئے ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لطیف الزّماں خاں کا مزاج کلاسیکی ہے۔ وہ روایات کے امین اور علی گڑھ کے پرورده ہیں۔ جن نظم پاروں، شعروں، شاعروں اور شاعری سے وہ اپنے مکتوبات کو لائق توجہ بناتے ہیں۔ وہ سب کے سب کلاسیکی روایات کے امین ہیں۔ لطیف الزّماں خاں نئی شاعری، نئی نظم یا آزاد نظم سے قطعاً متاثر ہیں۔ انھیں اس بات کا بھی قلق ہے کہ شاعری میں نئے تجربات اور لسانی تشکیلات نے زبان کو فائدہ نہیں پہنچایا، بلکہ اُردو زبان کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ وہ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر وحید اختر اور جوش ملیح آبادی کے نظم پاروں اور غزلوں سے تو جی بہلا سکتے ہیں مگر انھیں ظفر اقبال اور سلیم احمد کے شعری تجربات ہضم نہیں ہوتے۔ لطیف الزّماں خاں جن نظم پاروں سے عارف ثاقب کو آگاہ کرتے اور معنویت کا ذکر کرتے ہیں اِس معنویت میں حسن ہے، محبت ہے، شعلۂ عشق کی دھیمی دھیمی لو ہے، کسک ہے، ناگفتنی ہے اور کبھی ایسی ''گفتنی''کہ ''چھپائے نہ بنے''۔ ایسے ہی ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کو علم ہو گا عقیدت کی راہ سے گزر کر جو شخص محبت کی رہ گزر
پر آیا ہے اُس کے اپنے جسم کو ہی نہیں، دل کو بھی جلا لیا ہے۔ مجرہ میں
تنہا بیٹھ کر گرمی کی تپش کی پرواہ کیے بغیر سلگتے رہنا آسان کام نہیں
ہے۔ میں نے ایک دن ان بجھی بجھی آنکھوں میں جو کچھ پڑھا ہے وہ یہ ہے:

تیرے جمالِ سحر پاش و تاب ناک کی خبر
وہی سحر ہے جو چمکے امیدِ دید کے ساتھ

وہ صبح جس میں نہ شامل ہو روشنی تیری
اُسے بھی رات سمجھتے ہیں تیرے ہجر زدہ

نہ جانے کون سی ساعت میں تجھ کو دیکھا تھا
یہ جانتے ہوئے چاہا کہ پا نہیں سکتا
یہ جانتے ہوئے پوجا تجھے خیالوں میں
کہ پتھروں کو دھڑکنا سکھا نہیں سکتا!''(۲۱)

لطیف الزّماں خاں شعری ذوق اور شعری مزاج رکھتے ہیں۔ انھیں متعدد شعرا کے اشعار، نظمیں، غزلیں زبانی یاد ہیں۔ لطیف الزّماں خاں کے شعری ذوق پر بات کرتے ہوئے اُن کے دیرینہ کولیگ(جو رحیم یار خاں کالج میں اُن کے رفیق رہے) پروفیسر سیّد بنیاد حسین نقوی ، لطیف الزّماں کے شعری ذوق پر بات کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ۱۹۶۱ء میں جب ہم رحیم یار خاں کالج میں اکٹھے تھے انھوں نے انگریزی کی ''بلینک ورس'' کی طرز پر تھوڑی بہت طبع آزمائی کی ۔لیکن اسے کہیں چھپنے کے لیے نہیں بھیجا بلکہ یہ کاوش اُن کی ذات تک محدود رہی اور انھوں نے اس کی اشاعت کی کوشش نہیں کی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے ایسی ایک دو چیزیں دیکھیں۔ جس طرح مولانا ابو الکلام آزاد کو فارسی، عربی اور اُردو میں قادر الکلامی حاصل تھی اور انگریزی میں ان کا وہ مرتبہ نہیں تھا۔ اسی طرح لطیف الزّماں خاں کو شاعری پر وہ گرفت حاصل نہ تھی جو وہ اپنے دیگر شغف کے حوالے سے محسوس کرتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے کبھی اس کی پیشکش کی کوشش نہ کی۔(۲۲)جب وہ چند بے تکلف دوستوں یا احباب سے محوِ کلام ہوتے ہیں تو ان کی طبع موزوں ہونے لگتی ہے اور وہ مختلف شعری اقتباسات اپنے خطوط میں درج کرتے ہیں۔ وہ بے لاگ تبصرہ کرتے چلے جاتے ہیں، مگر یہ تبصرہ محض عبارت آرائی نہیں ہوتا بلکہ اس تبصر ہ میں، اس تشریح میں مکمل تحقیقی شعور، تجزیاتی فکر اور ذہنی بالیدگی بخوبی دکھائی دیتی ہے۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کی فکر سے کچھ قدم آگے نکل کر وہ تعبیرِ معنی کے ایسے راستوں پہ لیئے چلتے ہیں کہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود شعری تجربے کو بخوبی سمجھتے اور اُن کیفیات کے انجذاب سے گزرے ہیں، جو شعر کی تفہیم عطا کرتی ہیں:

> ''تم چلی آئی ہو، آنکھوں میں بسائے ہوئے خوابوں کے جہاں'' ہر لڑکی جب جوانی میں قدم رکھتی ہے، تو آہستہ آہستہ خواب دیکھنا شروع کرتی ہے پھر وہ وقت آتا ہے جب خواب ایک دو نہیں بلکہ ایک جہاں اپنے ذہن میں بنا اور بسا لیتی ہے اور خوابوں کے اس جہان سے وہ اُس وقت باہر آتی ہے، جب کوئی کہتا ہے ''تم چلی آئی ہو'' یہ حیرانی اُس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب وہ یہ نہیں جان پائی کہ اِس شخص کو کیسے معلوم ہوا کہ میں نے خوابوں کا جہاں بسا رکھا ہے---- وہ کہتا ہے ''تم نہیں جانتیں، تعبیر کے صحرا میں جو حیرانی ہے''۔ ''تم نہیں جانتیں'' کہ کر وہ اُس کی معصومیت کا اقرار کرتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے ''خوابوں کے جہاں میں'' اور یہ خوابوں کا جہاں اُس کا اپنا ہے۔ اُس میں لق و دق صحرا ہے اور حیرانی کا سبب یہ ہے کہ دل ایک صحرا ہے ایسے ویرانے میں کون آیا؟ پھر یکایک یہ احساس جاگتا ہے کہ کوئی اس کی خاطر آیا ہے تو کہتا ہے ''تم چلی آئی ہو'' اب اگر معصوم جوانی ہلاک ہو جائے تو اس میں تعجب کیوں؟''(۲۳)

یہ اقتباس، یہ تشریح، یہ تعبیرِ معنی کے دلائل، لطیف الزّماں خاں کو اُن ادبا کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ جن کے تخیل کی رسائی، شاعر کے تخیل سے ہم آہنگ بلکہ اس سے بھی ایک درجہ آگے پہنچ کر نئے مفاہیم اور نئے مکتب فکر سے روشناس کرواتی ہے۔ یہ تخیل ایک حساس انسان کا تخیل ہے، یہ ایک مشاہدہ کار کا تخیل بھی ہے۔ یہ تخیل معاشرے کے ایک ایسے فرد کا تخیل ہے، جس نے انسانی اور تہذیبی اقدار کو پرکھا ہے۔ اُن کی قدر کی ہے اور اُن اقدار کی قدر کی ترغیب دی ہے۔

جس کے خمیر میں اُردو، علی گڑھ تہذیب، ہمدردی، دل داری اور احساسِ مرگ و زیست کے ساتھ ساتھ محبت کے لطیف جذبات کی تکریم اور تعظیم کے رنگ ہر دم معجزن ہیں۔ شاعری پر مزید بات کرتے ہوئے وہ ڈاکٹر عارف ثاقب سے ایک شعر کے حوالے سے بات کرتے ہوئے، بات سے بات بڑھاتے بلکہ کچھ اہم نکات سمجھاتے چلے جاتے ہیں، لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ بیگم دو بچوں کے ساتھ اپنے سابقہ وطن علی گڑھ گئی ہوئی تھیں، اُن کا خط آیا تو اُس میں کسی لڑکی کا یہ بے مثل شعر نظر سے گزرا:

''آئینہ دیکھ کر خیال آیا
تم مجھے بے مثال کہتے تھے

میں کبھی اس شعر کو نہ بھول سکا۔ ذرا غور کیجیے کہ دوسرے مصرعے کے کتنے معانی نکلتے ہیں--- شعری اظہار ممکن ہی نہیں جب تک وہ تجربہ ، باطنی وجود کا حصہ نہ بن جائے''۔(۲۴)

لطیف الزّماں خاں کے یہ خطوط، بسا اوقات خود اُن کی ذات کے بھیدی بن جاتے ہیں۔ ان خطوط میں اہلیہ کا ذکر، اُن کی جدائی، بچوں کی فکر، ان کی خوشیاں، ذاتی زندگی کا تذکرہ، غرض یہ کہ زندگی کی متنوّع جہات کی طرح درد و غم اور خوشی کے بہت سے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ اہلیہ کی وفاداری، خلوص کا تذکرہ کرتے کرتے جب وہ اُن کی رحلت کا ذکر کرتے ہیں تو یہ سطور بڑے واضح لفظوں میں لطیف الزّماں خاں کے اُس دُکھ کی عکاسی کرتی ہیں جو اہلیہ کی جدائی کے ہاتھوں انھیں اٹھانا پڑا۔ اس دکھ کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کے بھی معترف رہے کہ ''اُس جیسی صبر کرنے والی اور ہر مشکل میں شوہر کا ساتھ دینے والی کوئی اور خاتون انھوں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔''(۲۵) اس حوالے سے مزید بات کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''بہت پرانی بات ہے، ایک خاتون بیٹھی مرحومہ سے باتیں کر رہی تھیں۔ میں کمرہ سے باہر نکل رہا تھا کہ بیوی کے الفاظ میرے کان میں پڑے۔ دنیا میں ایسی عورت پیدا نہیں ہوئی جو میرا شوہر مجھ سے چھین لے۔ ایک مرتبہ وہ علی گڑھ گئی ہوئی تھیں، خط آیا تو اس میں ایک شعر لکھا ہوا تھا:

عمر بھر میں نے تجھ پہ ناز کیا
تو کسی دن تو ناز کر مجھ پر

اہلیہ کے انتقال کو دس سال ہو گئے۔ کبھی ایک لمحہ کو بھی یہ خیال نہ آیا کہ میں کسی لمحاتی لذت کے لیے اُس سے بے وفائی کروں۔ میں آج بھی اُس کی رفاقت پر ناز کرتا ہوں، اُس پر ناز کرتا ہوں''۔(۲۶)

اولاد کا ذکر ان کے سینے میں محبت اور اُن کے لہجے میں غرور بھر دیتا ہے۔ یہ دراصل خود انھی کی تربیت اور اُس تہذیب کا اثر ہے جس کے وہ خود پرورده ہیں۔ یہ محبت اُس محبت اور عقیدت کا بھی صلہ ہے جو وہ اپنے والدین کے لیئے رکھتے تھے اور جس محبت کی کسک وہ ہمیشہ محسوس کرتے رہے۔ ایسی ہی محبت وہ ڈاکٹر انیس ، اپنے بیٹے کی جانب سے محسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انیس کی محبت، خدمت اور خلوص میں کمی نہیں، عارف صاحب میرے چاروں بچے مہذب، مؤدّب، تعلیم یافتہ اور تابعِ فرمان ہیں۔(۲۷)

ڈاکٹر عارف ثاقب سے زندگی کی خوشیوں اور اولاد کی محبت کا تذکرہ اکثر خطوط میں کرتے ہیں۔ ایک خط میں خبر دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ۵فروری کو انیس باپ اور میں دادا بن گیا۔(۲۸)اور کبھی یہ خبر کہ ڈاکٹر مہ جبیں، میری بیٹی نے پورے ملک سے آئے ہوئے ڈاکٹروں میں سب سے زیادہ نمبر لیے اور اب اس کا داخلہ ایم فل میں ہو گیا اور اب وہ پی۔ایچ۔ڈی بھی کرے گی۔(۲۹)

ڈاکٹر عارف ثاقب کو لکھے خطوط میں جہاں وہ ایک طرف اُردو شاعری، علی گڑھ کے فلسفہ کے پروفیسر ڈاکٹر وحید اختر کی شاعری سے اقتباسات، متفرق اشعار اور غزلیں لکھ بھیجتے ہیں۔ اُس کے ساتھ ساتھ فارسی شعرا اور غالب کی غزلیات کے نمونے بھی بھیجتے ہیں۔ شاید وہ عارف ثاقب سے دلی طور پر اتنے قریب ہیں کہ اپنے ہر شوق اور پسند میں صرف انھیں ہی حصہ دار بنانا چاہتے ہیں۔ان خطوط میں لطیف الزّماں خاں کی ''فکر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند ہے''۔(۳۰)

لطیف الزّماں خاں ، غالب سے جس عشق کی انتہا پر ہیں ، اُسی میں سرشار ڈاکٹر عارف ثاقب کو غالب کی فارسی غزل بھیجتے ہیں۔ یہ وہ غزل ہے جس کا ایک شعر (جسے لطیف الزّماں خاں بے حد پسندیدہ اشعار کی فہرست میں شامل کرتے ہیں)اُن کے لکھے گئے خاکوں کی مرتّبہ کتب ''ان سے ملیے'' میں انتساب کے نیچے درج ہے:

''آں راز کہ درسینہ نہاں است نہ و عظست
بردار توآن گفت و بہ منبر نتواں گفت''(۳۱)

لطیف الزّماں خاں کے اپنے احباب اور دوستوں کو لکھے گئے خطوط میں علم و ادب کی گفتگو، غالب شناسی کی باتیں، رشید احمد صدیقی کے ادبی کام کو یکجا کرنے کی کوششوں اور خلوص کا تذکرہ تو بار بار ملتا ہے لیکن کسی خط میں بھی کسی دوست یا ادیب سے کسی فرمائش کاتذکرہ نہیں ہے۔ البتہ ڈاکٹر عارف ثاقب سے محبت اور دوستی کا رشتہ ایسا ہے کہ عمروں کے تفاوت کے باوجود خان صاحب کے اکثر خطوط میں بعض فرمائشوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ کبھی یادہانی کے رنگ میں بات کرتے ہوئے کہتے ہیں نہ آپ جرمنی جائیں گے نہ اچھے کاغذ کے دستے اور لفافے آئیں گے۔(۳۲) اسی طرح ایک اور خط میں یہ تذکرہ ملتا ہے کہ جو کاغذ اور قلم کے نب آپ میرے لیے لائے تھے میں نے پتھر پر گھس کر اس قلم کو لکھنے کے قابل بنا لیا ہے۔(۳۳) اس کے علاوہ اپریل ۲۰۰۳ء کو لکھے گئے خط میں بھی بڑا تفصیلی تذکرہ موجود ہے:

''جب امریکہ تشریف لے جائیں اور وہاں کسی ڈپارٹمنٹل سٹور میں جانا ہو تو ''Arabic Calligraphy'' تلاش کیجیے۔''Shafers'' اور ''Parkers'' دو قلم بنانے والی ایسی کمپنیاں ہیں جن کے fountain penدنیا بھر میں مشہور ہیں، امریکہ میں بھی۔ بالفرض شیفرز اور پارکر کے قلم نہیں ملتے تو جس کمپنی کے مل جائیں لے لیجیے۔ ایک ہو تو نب کی موٹائی اتنی ہی ہو جتنی موٹائیوں کے ایک سیٹ میں ہوتے ہیں۔ عقلمند انسان دو چھتریاں رکھتا ہے اور عقلمند مسلماں دو بیویاں رکھتا ہے۔ میں عقلمند نہ سہی لیکن دو قلم رکھنا چاہتا ہوں''۔(۳۴)

ڈاکٹر عارف ثاقب سے محبت، انس اور شفقت کے اس رشتے کا خود لطیف الزّماں خاں کو بھی اندازہ ہے، اپنے ایک خط میں اُن سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں نے ڈاکٹر صدیق جاوید کو تین خطوط لکھے لیکن اُنھوں نے کسی ایک خط کا بھی جواب نہیں دیا۔ میں نے خاموشی اختیار کر لی، اگر کوئی شخص میرے خط کا جواب نہ دے تو پھر میں اُس کو خط کا جواب نہیں دیتا۔ ایسے لوگوں کے لیے وہ پیچھے مڑ کے دیکھنے کے عادی نہیں۔ لیکن عارف ثاقب کو باور کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ واحد انسان ہیں، ایک Exceptionکہ آپ خط کا جواب نہیں دیتے تب بھی خط لکھتاہوں کہ آپ سے میرے تعلق کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔(۳۵)

تعلق کی اس نوعیت کا ہی رنگ ہے کہ لطیف الزّماں خاں کے کسی بھی دوست یا ادیب کو لکھے گئے خطوط میں اولاد کے بارے میں اتنا تفصیلی تذکرہ نہیں ہے کہ چھوٹی چھوٹی جزئیات کا

بھی بیان ہو۔ اپنے بچوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُن کی تعلیم و تربیت میں میری مرحومہ اہلیہ کا حصہ زیادہ ہے اور اپنی ساری اولاد میں مجھے اپنی بیٹی گڑیا(مہ جبیں) بہت عزیز ہے(۳۶)۔ لطیف الزّماں خاں ڈاکٹر مہ جبیں کی سلیقہ شعاری، نرم گفتاری اور ہوش مندی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ میری بیٹی میں غرور اور تکبر نام کو بھی نہیں ہے۔ گھر کا سارا کام بھی وہ خود کرتی ہے جبکہ میری چھوٹی بیٹی لالہ رُخ مزاجاً خاموش طبع ہے، وہ بہت ہی کم سخن ہے اور اُس کا حلقۂ احباب بھی صرف ایک دوست تک محدود ہے، بہت بامطالعہ مصوّر ہے، بہت کم کسی سے ملتی ہے لیکن مہمان نوازی میں کبھی کوتاہی نہیں کرتی''۔(۳۷) ۲۲۔نومبر ۲۰۰۱ء کو لکھے گئے خط میں بیٹوں اور بہو کی بابت بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس مرتبہ ڈاکٹر انیس اور اُن کی بیگم، عید کراچی میں ہی منائیں گے ۔ مجھ پر بھی یہ پریشر ہے کہ اُن کے ساتھ ہو لوں کیونکہ صورتِ حال یہ ہے کہ چھوٹے صاحبزادے تنویر الزّماں خاں عید کے فوراً بعد کینیڈا چلے جائیں گے ان کی شادی وہیں اُن کی ماموں زاد سے ہو گی۔(۳۸) لطیف الزّماں خاں ، ڈاکٹر عارف سے صرف یہی نہیں کہ ذاتی زندگی اور بچوں کی باتیں ہی کرتے ہیں بلکہ انھیں اپنی عادات تک بتلاتے ہیں۔ طویل خط لکھنے کی بابت بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں نے طویل خط اس لیے لکھنے شروع کیے کہ میرے مرحوم دوست نظیر صدیقی سے میری جب خط و کتابت ہوا کرتی تھی تو وہ مجھے کہتے تھے کہ مختصر خط نہ لکھا کرو بلکہ طویل خط لکھا کرو۔ ان کی اس بات کے پیش نظر میں اس بد عادت میں ایسا گرفتار ہوا کہ آج تک جاں نہیں چھوٹی۔ یہی وجہ ہے کہ طویل خط لکھنے کی عادت اُن کے زیادہ تر خطوط میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔(۳۹)

لطیف الزّماں خاں کے ''انشائے لطیف'' جلد اوّل تا پنجم میں شامل زیادہ تر خطوط مبنی بر طوالت ہیں۔ یہ طوالت بات برائے بات بھی ہے۔ سوالوں کے جوابات اور ادبی موضوعات پر تبصروں پر مشتمل بھی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر عارف ثاقب کے ساتھ یہ خط و کتابت بعض اوقات خود کلامی، دلی جذبات کے بیان، نجی اور ذاتی زندگی حالات کے پیرایے میں ایک کتھارسس کی سی کیفیت کا رنگ بھی لیے ہوئے ہے۔ نظیر صدیقی کے ساتھ خط و کتابت میں بھی یہ رنگ نظر آتا ہے۔البتہ جلد پنجم میں شامل ڈاکٹر عارف ثاقب کو لکھا گیا ایک خط تمام خطوط میں سب سے مختصر ہے جس کا متن غصے اور جھنجھلاہٹ دونوں کی ترجمانی کرتا ہے:

> ''خط آپ نہیں لکھتے۔ خط کا جواب آپ نہیں دیتے۔ رات کو ساڑھے گیارہ بجے تک آپ کا ٹیلی فون انگیج ملتا ہے۔ بتائیے کیا کریں کس سے منصفی چاہیں۔ وہ نمک حرام، ڈاکٹر گیان چند جین ۱۹۔اگست کو امریکہ میں مر گیا۔ یہ بتا دیجیے کہ آپ کا حال کس سے پوچھوں؟''۔(۴۰)

لطیف الزّماں خاں کے عارف ثاقب کو لکھے گئے خطوط میں زندگی کا ہر رنگ پنہاں ہے۔ کبھی غصہ، کبھی شکایت کبھی ادب پر بحث، کبھی ادبی سرقوں کی باتیں، کبھی غمِ دوراں کبھی غمِ جاناں اور کبھی خط لکھتے لکھتے شرارت آمیز مذاق اور مزاح گوئی جو زیرِ لب تبسم سے کھل کر ہنسنے تک لے جاتا ہے۔ عارف ثاقب کو شرارت آمیز لہجے میں تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ گلے لگ کر رونے میں بھی کوئی حرج نہیں مگر اس میں انتخاب اچھے گلے کا کیجیے۔ (۴۱) ڈاڑھی رکھنے کی بات پر عارف ثاقب سے دلچسپ مکالمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ذرا مجھے یہ تو بتائے کہ کیا آپ کی عمر ایسی ہے کہ آپ ابھی سے ڈاڑھی رکھیں۔ خالد صاحب کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر انھوں نے ڈاڑھی نہیں رکھی ہے تو شاید اُس کی وجہ یہ ہو گی کہ وہ بیوی اور بچوں کو ڈرانے اور دھمکانے کے لیے نہ رکھتے ہوں گے لیکن مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی کہ آخر آپ پر کیا افتاد پڑی کہ آپ نے یہ ارادہ کر لیا۔(۴۲)

یہ بتائیے کہ ابھی آپ کی عمر ایسی نہیں ہے کہ ڈاڑھی رکھیں۔ خالد صاحب کی اور بات ہے وہ بچوں کو ڈرانے اور بیوی کو دھمکانے کے لیے ڈاڑھی نہ رکھتے ہوں گے۔ وہ خاموش طبع تو ہیں ہی، سنجیدگی کو قائم رکھنے کے لیے چہرہ ''نورانی'' رکھا ہو گا مگر آپ پہ کیا افتاد پڑی؟''(۳۳)

ڈاکٹر عارف ثاقب سے محبت اور شیفتگی کے اظہار میں ذومعنی باتیں کرتے، اپنے دل کے بعض بھیدوں کا پتہ دیتے اور افسانوی رنگ میں اُنس و محبت کی تشریح کرتے چلے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عارف ثاقب کی آنکھوں سے بات شروع کرتے کرتے ایک خود کلامی کی سی کیفیت میں بات کرتے ہوئے کہتے ہیں، میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں، کچھ آنکھیں عجیب ہوتی ہیں، دیکھتی رہتی ہیں، بولتی رہتی ہیں، باتیں کرتی ہیں، خود سوجاتی ہیں مگر دوسروں کی نیند اڑا دیتی ہیں، ان کا ڈسا ہوا پانی نہیں مانگتا، یہ آنکھیں جینے دیتی ہیں نہ مرنے دیتی ہیں، آپ ان اور ایسی ہی باتوں کی وجہ سے عزیز ہیں(۳۴) اس افسانوی اظہارِ بیاں کے ساتھ ساتھ وہ ڈاکٹر عارف کے نام لکھے گئے خطوط میں ڈاکٹر وحید اختر کی بعض نظمیں دہراتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنے دل کے جذبات کو ان نظموں کے پیرایے میں بیان کرتے ہوئے ،ڈاکٹر وحید اختر سے اپنی رفاقت نبھاتے ہوئے انھیں یاد رکھنا اور یاد رکھوانا بھی چاہتے ہیں۔ جبھی ہر دوسرے خط میں گھوم پھر کے، ڈاکٹر وحید اختر کی نظموں کو رقم کرتے ہوئے کچھ اَن کہی باتیں کہتے چلے جاتے ہیں:

''کتنی نرمی سے یہ مجمع مجھے سمجھاتا ہے
عظمتِ غم سے جو منکر ہے وہ دل پتھر ہے
اسی شعلے سے رگِ سنگ میں جلتے ہیں چراغ
اسی حدت سے چٹختے ہیں اندھیروں کے ایاغ
پھر گدازِ دلِ غم خوردہ سے کیوں کام نہ لیں
ہو جو تریاق بھی اُس زہر کا کیوں جام نہ لیں
بزمِ تنہائی میں آتے ہوئے یہ ہم نفساں
دور و نزدیک سے آواز دیے جاتے ہیں
آؤ اک دوسرے کے غم کو سمجھنے کے لیے
آؤ انسان کی تقدیر بدلنے کے لیے''(۳۵)

ایسی ہی بے شمار نظمیں اور نظم پارے ڈاکٹر عارف ثاقب کو لکھتے ہوئے کبھی کبھی اپنے دل کا بھید بھی بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کا اور ثاقب صاحب کا مزاج ایک سا ہے اور دونوں کو ایک سی نظمیں اور غزلیں پسند آتی ہیں۔ یہ انسانی نفسیات ہے کہ جس سے ہماری ذہنی ہم آہنگی ہو، مزاج ملتا ہوہم اُسی شخص کے سامنے دل کی بات کر سکتے ہیں۔ ہم زندگی میں پیش آنے والے دکھ اور سکھ، اپنی دلچسپیوں اور شوق کا تذکرہ اُسی سے کرتے ہیں، جس کے بارے میں ذہن و دل یہ اطمینان بخشے کہ اس سے دل کی بات کی جا سکتی ہے۔ غالباً لطیف الزّماں خاں کو یہ اطمینان، یہ طمانیتِ قلب، ڈاکٹر عارف ثاقب سے بات کرنے سے حاصل ہوتی ہےلکھتے ہیں کہ آپ کو ماضی قریب ستاتا ہے اور مجھے ماضی بعید، ایسا کیوں ہے کہ جو درد آشنا ہیں وہی نہیں ملتے''۔(۳۶)

دل کی افسردگیٔ شوق کے بیان کے ساتھ ساتھ وہ ڈاکٹر عارف سے بات کرتے ہوئے دل کے بھیدوں کے دریچے کو وا بھی کرتے چلے جاتے ہیں، وہ بھید جو قبل ازیں لطیف الزّماں خاں نے کبھی کسی کے سامنے نہیں کھولے، وہ ڈاکٹر عارف ثاقب سے خط و کتابت میں خودبخود کھلتے چلے جاتے ہیں:

''زندگی میں آپ دوسرے انسان ہیں جن کے خط کا شدید انتظار رہا ہے۔ پہلا انسان وہ جس کا اُردو، فارسی اور انگریزی ادبیات کا مطالعہ قابلِ رشک تھا اور طویل عرصہ تک جسے میں خط لکھتے یا خط کا جواب لکھتے ہوئے دس مرتبہ سوچتا تھا اور پھر یہ ہوا کہ ''صحبتِ یار آخر شُد'' پانچ سال کے عرصہ میں پانچ سو خط آئے اور اس سے زیادہ گئے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ آنسوؤں اور آہوں کے ساتھ میں نے اُس فائل کو اپنے ہاتھوں سے جلایا جس میں ایک ہزار سے زیادہ خطوط تھے''۔(۳۷)

ڈاکٹر عارف ثاقب سے بذریعہ خط بات کرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ باہم آمنے سامنے ہیں اور دو بے تکلف دوستوں کی مانند کبھی دل کا درد بٹاتے اور کبھی اپنا دل ہلکا کرتے ہیں۔ نادر کاکوروی کی ترجمہ کی گئی نظم کی بازگشت اُن کے بعض خطوط میں شدت سے محسوس ہوتی ہے، جس نظم میں وہ گذرے دنوں اور احباب کو یاد کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اکثر شبِ تنہائی میں
کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دلچسپیاں
بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی اور ڈالتے ہیں روشنی،
میرے دلِ صد چاک پر
لے دیکھ شیشے میں مرے
ان حسرتوں کا خون ہے
جو گردشِ ایّام سے
یا حسرتِ ناکام سے
جو آرزوئیں پہلے تھیں،
پھر غم سے حسرت بن گئیں.....
غم دوستوں کی موت کا، ان کی جواناں موت کا
لے دیکھ شیشے میں مرے، ان حسرتوں کا خون ہے
جب آہ ان احباب کو، میں یاد کر اٹھتا ہوں جو
یوں مجھ سے پہلے اٹھ گئے،
جس طرح طائر باغ کے، یا جیسے پھول اور پتیاں
گر جائیں سب قبل از خزاں، اور خشک رہ جائے شجر''(۳۸)

لطیف الزّماں خاں گزرے زمانے اور دوستوں کو یاد کرتے ہوئے نثری پیرایے میں نادر کاکوروی کے رنگ میں رقم طراز ہیں:

''عارف صاحب! اب تنہائی ستانے لگی ہے۔ خیال آیا بمبئی جاؤں، مگر وہاں میرا ہے کون؟ میرا بھائی کالی داس گپتا رضا__چلا گیا۔ میرے کرم فرما علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، راجندر سنگھ بیدی اور اختر الایمان، یہ سب زمین نے کھا لیے اور ہاں وہ راجندر سنگھ صاحب کا دوست۔ بمبئی میں بیدی کا واحد دوست باقر مہدی چلا گیا۔ اب بمبئی جا کر کیا کروں گا۔ اب کراچی جاتے ہوئے بھی خوف آتا ہے۔ وہاں کئی ہم جماعت پیوندِ زمیں ہو گئے۔ غلام محمد نون کشمیری، کیسا خوب صورت، رنگ ایسا کہ سیب شرمائے، گھنگھریالے بال، بے مثل ڈیبیٹر، چلا گیا۔ ثروت کمال، مصطفیٰ حسین، زاہد، شریف احمد خاں خلجی، نفیس انصاری__یہ سب مجھے چھوڑ

کر چلے گئے۔ جینا بے حیائی ہے۔ نیند آتی ہے نہ موت دونوں کو جیسے مجھ سے دشمنی ہو گئی ہے۔ یارِ عزیز محمد طفیل ایڈیٹر نقوش چلا گیا۔ عارف صاحب! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے ۔ آج دل اچاٹ ہے''۔(۴۹)

لطیف الزّماں خاں کے یہ خطوط اپنے مندرجات کے حوالے سے بجائے خود، تحقیق کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ کتب، رسائل، مضامین کے حوالے سے مکمل معلومات کا خزانہ ان خطوط میں مضمر ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ بہت سے اہم امور کی وضاحت اور بہت سی اغلاط کی نشاندہی اور تصحیح ان خطوط کے تحقیقی و تنقیدی جائزہ سے پتا چلتی ہے۔ لطیف الزّماں خاں کے شاگرد پروفیسر عبد العزیز بلوچ نے اُن کا خاکہ بعنوان ''استاد'' لکھتے ہوئے اس بات کا تذکرہ بھی کیا کہ استاد نے قرآن پاک کا بامحاورہ ترجمہ کیا ہے اور اسی طرح ان کی خوش خوراکی اور چٹورپن کی باتیں کرتے ہوئے، ان کے علی گڑھ میں تعلیم پانے کی بابت لکھا ہے۔(۵۰) لطیف الزّماں خاں ، ۲۴۔ستمبر ۲۰۰۱ء کو، ڈاکٹر عارف ثاقب کے نام لکھے گئے خط میں لکھتے ہیں کہ کسی بلوچ صاحب نے میرا خاکہ لکھا ہے مگر وہ خاکہ کی تعریف سے نابلد ہیں۔ اس حوالے سے مزید بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے کبھی علی گڑھ میں تعلیم نہیں پائی۔ یہ میری بدقسمتی ہے۔ میں نے کبھی بلوچ صاحب کے ساتھ کھانا نہیں کھایا۔ چٹورپن کہاں سے آ گیا۔۔۔ خدا بھلا کرے بلوچ صاحب اور سطور کے مرتبین کا ، مجھ سے ایسی باتیں منسوب کر دی ہیں جو مجھ میں کبھی تھیں ہی نہیں''۔(۵۱)

لطیف الزّماں خاں ،ڈاکٹر عارف ثاقب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ طالب جوہری تشریف لائے اور دورانِ گفتگو یہ شعر پڑھا: ''چند تصویرِ بُتاں چند حسینوں کے خطوط بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا''۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ یہ شعر غالب کاہے جبکہ میں نے اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ:

''شعر غالب سے منسوب تو ہے مگر غالب کا نہیں ہے۔ غالب کے دیوان (متداول) میں چھ اشعار کی غزل موجود ہے اور اسی زمین میں نسخۂ حمیدیہ میں بھی غزل چھپی، مگر یہ شعر دونوں غزلوں میں نہیں ہے۔ غالب کی زندگی میں دیوانِ غالب پانچ مرتبہ شائع ہوا۔ کسی ایڈیشن میں مندرجہ بالا شعر نہیں ملتا۔ اب تک جو نسخے دریافت ہوئے ہیں۔ کسی میں یہ شعر نہیں ہے (نسخۂ خواجہ میں نے ابھی پڑھا نہیں ہے،لیکن اس میں بھی یہ شعر نہ ہو گا، ایسا خیال ہے) سب سے پہلے یہ شعر دیوانِ غالب، نظامی ایڈیشن، بدایوں کے چوتھے ایڈیشن میں ملتا ہے۔ لیکن ۱۹۲۲ء میں نظامی صاحب نے جب نیا ایڈیشن شائع کیا تو یہ شعر حذف کر دیا۔ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ شعر غالب کا نہیں ہے۔ اسی لیے آخری دو ایڈیشنوں میں یہ شعر نہیں ملتا۔ شعر کا صحیح متن یہ ہے:

ایک تصویر کسی شوخ کی اور نامے چند
گھر سے عاشق کے پسِ مرگ یہ ساماں نکلا

غالب سے منسوب شعر میں ''چند تصویر'' آیا ہے۔ تصویر واحد ہے۔ تصاویر ہو تو مصرع خارج ازوزن ہو جائے گا۔ یہ اعتراض ہی اسے غالب کا شعر نہیں رہنے دیتا۔ لیکن جب ''ایک تصویر کسی شوخ کی'' تو مصرع میں نقص نہیں رہتا۔ یہ شعر عاشق حسین بزم اکبر آبادی کا ہے''۔(۵۲)

ڈاکٹر عارف ثاقب کو ایک خط میں تسلی و تشفی دیتے ہوئے اور حوصلہ بڑھاتے ہوئے وہ جن خیالات کا اظہار کرتے ہیں وہ لطیف الزّماں خاں کی شخصیت کا ایک اور رنگ ہمارے سامنے لے آتے

ہیں۔ یہ رنگ اُن کے اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقینِ کامل اور صبر و قناعت سے زندگی گزارنے اور توکّل کے رنگ سے عبارت ہے اور جس کی بالواسطہ تلقین وہ ڈاکٹر عارف ثاقب کو کر رہے ہیں:

> ''میرا جی چاہا کہ اُڑ کر لاہور پہنچ جاؤں اور آپ کو گلے لگا لوں۔ اگر آپ روئیں تو میں بھی روؤں--- زندگی اللہ نے جینے اور گزارنے کے لیے دی ہے۔ یہ جو ہم ہر لمحہ کہتے ہیں کہ ہر حال میں اس کا شکر ہے، وہ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ زندگی سیدھی سڑک اور سایہ دار راستہ نہیں ہے کہ انسان آرام سے چلتا رہے۔ زندگی میں بڑے ناہموار موڑ آتے ہیں۔ بڑی پریشانیاں بڑے مصائب آتے ہیں تو کیا مر جائیں۔ نہیں۔''(۵۳)

الغرض یہ خطوط زندگی کے مختلف رنگوں کی قوسِ قزح کی مانند ہیں۔ یہ خط انسانی نفسیات کی مختلف پیچیدگیوں کے عکاس ہیں۔ یہ خطوط زندگی ہیں۔ وہ زندگی جس میں کبھی دکھ ملتے ہیں، کبھی کوئی اچانک خبر، خوشی کی برسات بن جاتی ہے۔ کبھی یادوں کے دریچوں سے گزرے دنوں کی دلچسپیاں جھانکنے لگتی ہیں۔ کبھی اپنوں کی جدائی، کبھی ملن، کبھی ذمہ داریوں کے بوجھ، کبھی ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی خوشی، کبھی اولاد کے لیے تفکرات، تو کبھی ان کی خوشیوں میں خوش ہو جانے کی باتیں، کبھی معاش کے مسائل تو کبھی کشائش کے قصے، کبھی ترکِ محبت تو کبھی رنگِ محبت، کبھی دھوپ، کبھی چھاؤں۔ العرض یہ خطوط ایک مکمل زندگی کے ترجمان ہیں۔ ان خطوط میں دوستوں سے دل لگی بھی ہے، ناراضی بھی ہے۔ ملکی حالات کا تذکرہ ہے، ادبی و تحقیقی بحثیں ہیں۔ نجی زندگی کے نشیب و فراز کی باتیں ہیں۔

مختصراً ہم ان خطوط کو تہذیب، ثقافت اور ادب و اقدار کا مرقع کہہ سکتے ہیں۔یہ خطوط محبت، خلوص، شفقت اور محبت سے لبریز ہیں۔ یہ خطوط ایک مشفق استاد کے خطوط بھی ہیں اور ایک بے لاگ تنقید نگار کے تبصرے بھی ہیں۔ کبھی یہ خطوط اپنے پیرایۂ اظہار میں شعلہ ہیں، کبھی شبنم ہیں۔ کبھی یہ تالیفِ قلب کا ذریعہ ہیں تو کبھی ایسے تند و تلخ جملوں کا مرّقع ہیں کہ حرکتِ قلب بند ہوتی محسوس ہو۔ الغرض یہ خطوط لطیف الزّماں خاں کی شخصیت کی مانند اجتماعِ ضِدّین کا مرّقع ہیں۔ یہ خطوط لطیف الزّماں خاں کی سیرت کے اصل خدّوخال کا تحریری رنگ ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ خورشید الاسلام، ''خطوط نگاری'' مشمولہ ، اُردو نثر کا فنی ارتقا، مرّتبہ: فرمان فتح پوری (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص۳۱۴

۲۔ عبد اللہ، سیّد، ڈاکٹر، اشاراتِ تنقید(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۳ء)، ص۳۰۰

۳۔ رفیع الدین ہاشمی، مرتبہ: اصنافِ ادب(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص۱۷۷

۴۔ عارف محمود ثاقب، ڈاکٹر، ''عرضِ مرتّب''، مشمولہ انشائے لطیف (جلد پنجم)، مرتّبہ:ڈاکٹر عارف محمود ثاقب، ص۸

۵۔ ایضاً

۶۔ لطیف الزّماں خاں، ''مکتوب بنام ڈاکٹر عارف محمود ثاقب''، مشمولہ انشائے لطیف(جلد پنجم) ، ص۸۲

۷۔ عابد علی عابد، سیّد، اصولِ انتقادِ ادبیات(لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۰ء)، ص۶۶

۸۔ لطیف الزّماں خاں، ''مکتوب بنام ڈاکٹر عارف محمود ثاقب''، مشمولہ انشائے لطیف (جلد پنجم) ، ص۸۲

۹۔ لطیف الزّماں خاں، ''مکتوب بنام ڈاکٹر عارف محمود ثاقب''، مشمولہ انشائے لطیف(جلد پنجم)، ص۳۹۲

۱۰۔ ایضاً، ص۵۰۱۔۵۰۲

۱۱۔ ایضاً، ص۵۰۲

۱۲۔ ایضاً، ص۵۰۲۔۵۰۳
۱۳۔ ایضاً، ص۳۹۳
۱۴۔ ایضاً، ص۳۹۷،۳۹۴
۱۵۔ ایضاً، ص۳۹۹
۱۶۔ ایضاً، ص۱۰۰
۱۷۔ ایضاً، ص۱۶۷
۱۸۔ ایضاً، ص۲۴۵
۱۹۔ ایضاً، ص۲۴۶
۲۰۔ ایضاً، ص۲۷۳
۲۱۔ ایضاً، ص۲۳۷
۲۲۔ منیبہ زہرا نقوی، پروفیسر بنیاد حسین نقوی ، "لطیف الزّماں خاں، یادیں اور باتیں"، بمقام ۳۶۴۔وائی، اقبال کالونی ، سرگودھا، ۸۔جولائی ۲۰۲۰ء
۲۳۔ لطیف الزّماں خاں، ''مکتوب بنام ڈاکٹر عارف محمود ثاقب''، مشمولہ انشائے لطیف(جلد پنجم) ، ص۳۸۸۔۳۸۹
۲۴۔ ایضاً، ص۳۸۹
۲۵۔ منیبہ زہرا نقوی ،محترمہ لالہ رُخ ، تاثرات بذریعہ فون ، مؤرخہ ۳۰۔ جون ۲۰۲۰ء
۲۶۔ لطیف الزّماں خاں، ''مکتوب بنام ڈاکٹر عارف محمود ثاقب''، مشمولہ انشائے لطیف (جلد پنجم) ، ص۲۸۹
۲۷۔ لطیف الزّماں خاں، ''مکتوب بنام ڈاکٹر عارف محمود ثاقب''، مشمولہ انشائے لطیف(جلد پنجم)، ص۶۰۲
۲۸۔ ایضاً، ص۵۶۷
۲۹۔ ایضاً، ص۶۱۹
۳۰۔ ابو الکلام آزاد، مولانا، غبارِ خاطر (لاہور: مکی دار الکتب، اُردو بازار، ۱۹۹۳ء)، ص۲۷
۳۱۔ لطیف الزّماں خاں، ''مکتوب بنام ڈاکٹر عارف محمود ثاقب''، مشمولہ انشائے لطیف(جلد پنجم) ، ص۵۲۱
۳۲۔ لطیف الزّماں خاں، ''مکتوب بنام ڈاکٹر عارف ثاقب'' مشمولہ، انشائے لطیف(جلد پنجم) ، ص۶۰۲
۳۳۔ ایضاً، ص۶۱۸
۳۴۔ ایضاً، ص۵۸۸
۳۵۔ ایضاً، ص۲۲۶
۳۶۔ ایضاً، ص۳۰۴
۳۷۔ ایضاً، ص۳۰۴
۳۸۔ ایضاً، ص۵۱۲
۳۹۔ ایضاً، ص۵۸۶
۴۰۔ ایضاً، ص۶۷۴
۴۱۔ ایضاً، ص۵۹۰
۴۲۔ ایضاً، ص۹۳
۴۳۔ ایضاً، ص۲۷۷
۴۴۔ ایضاً، ص۲۷۵۔۲۷۶
۴۵۔ ایضاً، ص۳۵۳
۴۶۔ ایضاً، ص۵۶۷
۴۷۔ نادر کاکوروی، انتخابِ کلام نادر کاکوروی، مرتبہ :ذکی کاکوروی (لکھنو: اتر پردیش اُردو اکادمی، ۱۹۹۱ء)، ص۳۰۔۳۱

۴۸۔ لطیف الزّماں خاں، ''مکتوب بنام ڈاکٹر عارف محمود ثاقب'' مشمولہ، انشائے لطیف (جلد پنجم) ، ص۶۴۸
۴۹۔ عبد العزیز بلوچ، ''استاد'' مشمولہ تجھے ہم ولی سمجھے، مرتّبہ: ڈاکٹر ابرار عبد السلام (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۸ء)، ص۱۴۳
۵۰۔ لطیف الزّماں خاں، ''مکتوب بنام ڈاکٹر عارف محمود ثاقب''مشمولہ انشائے لطیف (جلد پنجم)، ص۴۰۳
۵۱۔ لطیف الزّماں خاں، ''مکتوب بنام ڈاکٹر عارف ثاقب''مشمولہ، انشائے لطیف (جلد پنجم) ، ص۲۲۱
۵۲۔ لطیف الزّمل خل، ''مکتوب بنام ڈاکٹر عارف ثاقب''مشمولہ، انشائے لطیف (جلد پنجم)، ص۱۵۶

References

1. Khursheed ul Islam, Khatoot Nigari, Mashmola: Urdu Nasar ka Fanni Irtiqa, Murtaba: Farman Fateh Puri, Lahore: Alwaqar Publications, 2016, P.314
2. Abdullah, Syed, Dr., Isharat-e-Tanqeed, Islamabad: Muqtadra Qaumi Zuban, 1993, P.300
3. Rafee-ud-Din Hashmi, Muratab: Asnaf-e-Adab, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2008, P.177
4. Arif Mahmood Saqib, Dr., Arz-e-Muratib, Mashmola: Inshay Lateef, 5th Edition, Murataba: Dr. Arif Mahmood Saqib, P.8
5. Ibid
6. Lateef Uzaman Khan, Maktoob Banam Dr. Arif Mahmood Saqib, Mashmola: Inshay Lateef, 5th Edition, P.82
7. Abid Ali Abid, Syed, Asool-e-Intiqad-e-Adbiyat, Lahore: Majlis Taraqi Adab, 1960, P.66
8. Lateef Uzaman Khan, Maktoob Banam Dr. Arif Mahmood Saqib, Mashmola: Inshay Lateef, 5th Edition, P.82
9. Ibid, P.492
10. Ibid, P.501-502
11. Ibid, P.502
12. Ibid, P.502-503
13. Ibid, P.493
14. Ibid, P.494-497
15. Ibid, P.499
16. Ibid, P.100
17. Ibid, P.167
18. Ibid, P.245
19. Ibid, P.246
20. Ibid, P.273
21. Ibid, P.237
22. Muneeba Zahra Naqvi, Prof. Bunyad Hussain Naqvi, Lateef Uzaman Khan, Yadain aur Batain, Bamaqam 364 Y, Iqbal Colony, Sargodha, 8 July 2020
23. Lateef Uzaman Khan, Maktoob Banam Dr. Arif Mahmood Saqib, Mashmola: Inshay Lateef, 5th Edition, P.388-389
24. Ibid, P.389

25. Muneeba Zahra Naqvi, Mutarma Lala Rukh, Tasurat Bazarya Telephone, 30 June 2020

26. Lateef Uzaman Khan, Maktoob Banam Dr. Arif Mahmood Saqib, Mashmola: Inshay Lateef, 5th Edition, P.289

27. Ibid, P.602

28. Ibid, P.567

29. Ibid, P.619

30. Abu Al-Kalam Azad, Maulana, Gubar-e-Khatir, Lahore: Makki Dar-ul-Kitab, Urdu Bazar, 1993, P.27

31. Lateef Uzaman Khan, Maktoob Banam Dr. Arif Mahmood Saqib, Mashmola: Inshay Lateef, 5th Edition, P.521

32. Ibid, P.602

33. Ibid, P.618

34. Ibid, P.588

35. Ibid, P.226

36. Ibid, P.404

37. Ibid, P.404

38. Ibid, P.512

39. Ibid, P.586

40. Ibid, P.674

41. Ibid, P.590

42. Ibid, P.93

43. Ibid, P.277

44. Ibid, P.275-276

45. Ibid, P.353

46. Ibid, P.567

47. Nadir Kakorvi, Intikhab Kalam Nadir Kakorvi, Murataba: Zaki Kakorvi, Lucknow: Utar Pardesh Urdu Academy, 1991, P.30-31

48. Lateef Uzaman Khan, Maktoob Banam Dr. Arif Mahmood Saqib, Mashmola: Inshay Lateef, 5th Edition, P.648

49. Abdul Aziz Baloch, Ustad, Mashmola: Tujhe Hum Wali Samjhe, Murataba: Dr. Ibrar Abdul Salam, Multan: Becan Books, 2018, P.143

50. Lateef Uzaman Khan, Maktoob Banam Dr. Arif Mahmood Saqib, Mashmola: Inshay Lateef, 5th Edition, P.703

51. Ibid, P.221
52. Ibid, P.156